زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

زندگی کی اساس ریاضیاتی نہیں بلکہ امکاناتی ہے یعنی زندگی تعینات کا نہیں امکانات کا نام ہے۔فلسفہ و حکمت ہو یا جدید سائنسی انکشافات [1]، یہ ہمیں زندگی کے اس پہلو کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ 'تقدیراتِ حق لا انتہا' ہیں [2]۔ایک بابصیرت شخص زندگی کے مخفی اوران گنت امکانات کو دریافت کرتا اورانہیں بروئے کار لاتا ہے۔غالب جیسا نابغہ اس وصف سے بکمال متصف ہے کہ زندگی کو جتنی دقتِ نظری اور جامعیت سے غالب نے دیکھا یہ اس کا امتیاز ہے۔غالب کے 'فردوسِ تخیل' میں ان دنیاؤں کا وجود ملتا ہے جو 'قدرت کی بہار' کا منظر پیش کرتے ہیں۔[3] غالب زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے اور پھر زندگی کی اس جہت کو سب پر غالب کر دیتا ہے جو زندگی کو زندگی بنا دے۔مسرت وغم، کامرانی و ناکامی، حیات و موت سب زندگی کے رخ ہیں، مگر غالب نے اپنی ندرتِ فکر اور خلاق طبیعت سے زندگی کے روشن رخ کو نمایاں کرنے کی سعی کی ہے۔حتیٰ کہ اگر کہیں زندگی کے تاریک رخ کا تذکرہ بھی کیا تو اسے بھی قابلِ رشک بنا دیا:

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا، غالبؔ!
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد؟[4]

غالب کی شاعری 'زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں'[5] کی مظہر ہے۔قوتِ فکر کا یہ عالم ہے کہ زندگی کے مظاہر ہی نہیں بلکہ خود زندگی کے وجود، کنہ اور اصلیت کے بارے میں اس کے وجود وعدم، یعنی ہستی و نیستی دونوں کے بے حقیقت ہونے کے موقف کا حامل ہونے کے باوجود اس کے عدمِ وجود یا نیستی کو بھی درجہ وجود دے دیا:

ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالبؔ
آخر تو کیا ہے، اے 'نہیں ہے!'[6]

یہ امر طے ہے کہ زندگی کے امکانات پر نظر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خود زندگی اور اس کے عناصر ترکیبی پر نظر ہو۔غالب کے ہاں اس پہلو پر وافر اور کافی مواد ملتا ہے کہ غالب، زندگی کی بصیرت رکھنے والا

شاعر ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اس 'دیوار' میں بھی 'در' تلاش کر لیتا ہے جو دوسروں کو سدِ راہ نظر آ رہی ہو:

به فیضِ بے دلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا(۷)

درماندگی میں غالبؔ! کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا(۸)

دل ہوا، کش مکش چارۂ زحمت میں، تمام
مٹ گیا، گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا(۹)

غالب کی شخصیت اور فکر کے وہ پہلو جو امکاناتِ حیات کو اس کے سامنے منکشف کرتے ہیں، یہ ہیں:
۱۔ تصورِ کائنات، ۲۔ وسعتِ مشاہدہ، ۳۔ زندگی کے مثبت پہلو پر نظر، ۴۔ اسبابِ تخریب سے تعمیر کی استعداد

۱۔ تصورِ کائنات

غالب کا تصورِ کائنات اس روایت سے ماخوذ ہے جو شعری اور صوفیانہ وسائل سے غالب تک پہنچی۔ وجود و شہود کا مسئلہ ہماری عارفانہ شاعری کی روح رہا ہے اور اردو غزل بھی حقیقت ہو یا مجاز، دونوں حوالوں سے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے اسے وسیلہ بناتی رہی ہے۔ غالب کا امتیاز یہ ہے کہ گو غالب اس روایت کے تحت 'عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے' کا قائل ہے مگر غالب نے اس دام خیال کی تعبیر پر تعیین کی قدغن نہیں لگائی بلکہ اسے تعبیر کے لیے کھلا چھوڑ کر انسانی شعور کی آزادی کو تسلیم بھی کیا اور اسے 'باوجود' ہونے کا احساس بھی دلایا۔ غالب جب حقیقت عالم پر غور کرتا ہے تو کہتا ہے:

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے(۱۰)

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے(۱۱)

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے
کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے(۱۲)

کیوں کہ غالب کے نزدیک اس عالم کی تمام انجمن آرائی وہمی، اعتباری اور خیالی ہے:

شاہد ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ 'ہے' پر ہمیں منظور نہیں [۱۳]

ہے مشتمل نمود صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں [۱۴]

اور غالب کا یہ نقطہ نظر بیدل اور محمود شبستری کے اس موقف کا ترجمان نظر آتا ہے۔ بیدل کہتا ہے:

صورت وہمی بہ ہستی متہم داریم ما
چوں حباب آئینہ بر طاق داریم ما [۱۵]

محمود شبستری کے بقول:

ہر آں کس را کہ اندر دل شکے نیست
یقیں داند کہ ہستی جز یکے نیست [۱۶]

غالب حقیقت عالم پر غور کرتے ہوئے جب اسے وہمی، خیالی یا اعتباری تصور کرتا ہے تو یہاں وہ اپنے موقف کو حتمی یا نا قابل اعتراض قرار دے کر بابِ تحقیق و استفسار بند نہیں کرتا بلکہ خود سوال کرتے ہوئے اس پر مزید تفکر کے راستے کھولتا ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟ [۱۷]

دوسری جگہ کہتا ہے:

چو پیدا تو باشی نہاں ہم توئی
اگر پردہ باشد آں ہم توئی
بہر پردہ دمساز کس جز تو نیست
شناسندہ راز کس جز تو نیست

چہ باشد چنیں پردہ ہا ساختن
شگافے بہر پردہ انداختن
بدیں روئے روشن نقاب از چہ رُو
چو کس جز تو نبود حجاب از چہ رُو(۱۸)

پھر غالب خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:

کنی ساز ہنگامہ اندر ضمیر
چو نم دریم ورشتہ اندر حریر
ظہور صفات تو جز در تو نیست
نشانہائے ذات جز در تو نیست(۱۹)

چونکہ جہاں اللہ کی اپنی آ گاہی کا آئینہ ہے اور اس آئینے میں سب وجہ اللہ کا منظر ہے سو اگر چہ عالم خیال کی ہی آفرینش ہے مگر یہ خیال خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ کیونکہ یہ خیال دھوکا کھائے ہوئے انسان کا خیال نہیں ہے بلکہ خود خدا کا خیال ہے۔ جب عالم کو صحیح طور پر صفات الٰہیہ کا مظہر سمجھا جائے اور ہر جزو میں کل اور ہر جلوہ صفت میں ذات مطلق کی شان نظر آئے تو اس تجلی کو خدا کی اپنی خیال آفرینی ہی تصور کیا جائے گا۔ اس طرح جب خدا اپنے خیال سے جہان کی تخلیق کرے گا تو گو وہ جہان خدا کے خیال کے باہر موجود نہ ہوگا مگر اس جہان کا خدا کے خیال میں موجود ہونا خود اتنا زیادہ حقیقی ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

گل و بلبل و گلستاں نیز ہم
مہ و انجم و آسماں نیز ہم
نمودیست کاں را بود بود ہیچ
زیاں ہیچ و سرمایہ و سود ہیچ
بعرض شناسائی ہرچہ ہست
بوہم است پیدای ہرچہ ہست
نہ ہرگہ کہ تنہا نشینی بجائے
بخاطر کنی طرح بستاں سرائے
بہ آرائش باغ او آوری
دراں باغ از دجلہ جو آوری
دمانی گل و نرگس از روے خاک
نشانی بطرفِ چمن سرو و تاک

نوا گر کنی مرغ برشاخسار
بموج آوری آب در جوئبار
بخویش ارچہ داری گمانے ز باغ
بروں از تو نبود نشانے ز باغ
در اندیشہ پنہاں و پیداتوی
گل و بلبل و گلشن آرا توی(۲۰)

عالم کی اسی ماہیت اور اساس کا ذکر آگے بڑھاتے ہوئے غالب کہتا ہے:

خیالے در اندیشہ دارد نمود
ہماں غیبِ غیب است بزم شہود
نشانہائے راز خیالِ خودیم
نواہائے ساز خیالِ خودیم(۲۱)

گویا یہاں انسان کے خیال کی اہمیت اور باوجود ہونے کے بیان کا آغاز ہو گیا۔ انسانی خیال کا یہی وہ کردار اور فعالیت ہے جو اس کارخانہ ہست و بود میں انسان کو مرکزیت اور اختیار عطا کرتا ہے۔ باوجود ان گنت مشکلات اور عدم آگہی کے یہ وہ روزن امکان ہے جو انسان کو تفکر اور عمل کا راستہ عطا کرتا ہے اور وہ ان دیکھے امکانات کی دریافت اور انہیں بروئے کار لانے کی طرف بڑھتا ہے۔

عالم معنی میں غالب عقل فعال سے اسرار حیات کے بارے میں چند سوالات کرتا ہے۔ وہ اپنا دل و دین اس کی نذر کر کے اس سے استفسار کرتا ہے:

دوش در عالم معنی کہ ز صورت بالاست
عقل فعال سرا پردہ زد و بزم آراست
خو انداز دیدہ وری دیدہ وراں رابہ بساط
تابہ بینند کہ اسرار نہانی پیداست
چوں کس از ہم نفساں زخمہ برآں تار نزد
من کہ آزادیم انداز ورم از خویش اداست
رفتم آشفتہ و سرمست و پس از لالہ ولاغ
گفتم اینک دل و دیں، گفت خوشت باد کجاست (۲۲)

جب دل و دین کی نذر قبول ہو گئی تو اس کے بعد اسرار کے متعلق سوال و جواب شروع ہو گئے لیکن عقل فعال

نے شروع ہی میں کہہ دیا کہ کہ محرمیٔ ذات جو بے چون و چرا ہے، اس کے متعلق نہ پوچھنا، باقی جو چاہو پوچھو:

گفتم اسرار نہانی ز تو پرسش دارم
گفت جز محرمیٔ ذات کہ بیچون و چراست
گفتمش چیست جہاں؟ گفت سرا پردۂ راز
گفتمش چیست سخن؟ گفت جگر گوشۂ ماست(۲۳)

پوچھا کہ جہان کیا ہے؟ جواب ملا کہ سرا پردۂ راز۔ اس کے بعد اپنے دل پذیر شغل یعنی سخن کے متعلق دریافت کیا۔ خوف تھا کہ کہیں یہ بے حقیقت چیز نہ ہو لیکن جواب سے تسلی ہو گئی۔ جب عقل فعال نے کہا کہ سخن تو ہمارا لخت جگر ہے۔ جواب درست بھی تھا۔ عقل اور سخن ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ انسان کو ناطق اسی لیے کہتے ہیں کہ نطق کا لفظ عقل اور سخن دونوں معنی پر حاوی ہے۔ خدا نے بھی کائنات کو ایک کلمہ کے ذریعے سے پیدا کیا۔

پھر میں نے وحدت و کثرت کی باہمی نسبت کے بارے میں دریافت کیا کہ اصل مصدر حیرت یہی مسئلہ ہے۔ اس کا جواب ملا کہ موج و حباب و گرداب وہی دریا ہی ہے۔ یہ سب دریا کی ذات کے مظاہر ہیں۔ کثرت اشیا کی کوئی مستقل حیثیت نہیں:

گفتم از کثرت و وحدت سخنے گوی برمز
گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست(۲۴)

اسی خیال کو غالب نے اردو شعر میں بھی بیان کیا ہے:

ہے مشتمل نمود صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں(۲۵)

اس کے بعد عقل فعال سے اور سوالات بھی کیے گئے لیکن افسوس ہے کہ جو مسئلہ حقیقت میں حل طلب ہے اس کے جواب کو یونہی ٹال دیا گیا۔ پڑھنے والے کو بہت مایوسی ہوتی ہے۔ شاعر کے پاس نتائج اور وجدان ہی ہوتا ہے۔ اگر تو جیہ پوچھو تو وہاں بھی عجز ہی ہے۔ مثلاً یہ سوال کہ اگر سب کچھ وحدت ہی کا ظہور ہے تو کثرت کا وحدت سے تعلق تو کسی قدر قابل فہم ہو جاتا ہے۔ اور اکثر وجودی فلسفیوں نے اس بارے میں کچھ تسلی بخش استدلال بھی کیا ہے۔ لیکن قضیہ یہ ہے کہ ایک ہی وحدت کی کثرت میں باہمی تضاد اور کشاکش اور رد و قبول کہاں سے پیدا ہو گیا یہ تناقض کہاں سے آ گیا۔ اس کی بابت غالب عقل فعال سے پوچھتا ہے تو وہ بھی آہ بھرتی ہے اور کہتی ہے افسوس ہے کہ یہ رشتہ دست قضا میں ہے اور اس مشیت تک میری رسائی نہیں:

گفتم آیا چہ بود کشمکش رد و قبول
گفت آہ از سر ایں رشتہ کہ در دست قضاست(۲۶)

وجودی تشبیہات میں ایک عام تشبیہ خورشید اور ذرہ کی نسبت سے بھی اخذ کی گئی ہے۔ ہر ہستی ایک ذرہ کے مشابہ ہے جو آفتاب ذات سے مستنیر ہوتا ہے:

پر تو سے آفتاب کے ، ذرے میں جان ہے (۲۷)

سوال یہ ہے کہ ذرہ ذرہ ہی رہتا ہے یا ہمہ تن آفتاب بھی بن سکتا۔ جس ذات کے پرتو سے وہ قائم ہے اس سے ہم کنار ہوسکتا ہے یا نہیں۔ بعض صوفیہ اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور بعض نفی میں۔ یہ فنا اور بقا کا مسئلہ ہے کہ ذات الٰہی میں فنا ہو کر کسی قسم کی انفرادی بقا رہتی ہے یا نہیں۔ مولانا روم نے اس مسئلے کو لوہے اور آگ کے تعلق سے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ لوہا آگ میں رہ کر اس کے ہم رنگ اور ہم صفت ہو جاتا ہے۔ اس کا ذرہ ذرہ آتش بجان ہو کر انا النار کا نعرہ لگا سکتا ہے۔ لیکن صفات کو اخذ کرنے کے باوجود بھی اس کی ذات اور آگ کی ذات ایک نہیں ہو جاتیں، غالب عقل فعال سے پوچھتا ہے کہ ذرے کی پوری رسائی خورشید کی ذات تک ہوسکتی ہے یا نہیں؟ جواب ملتا ہے کہ یہ امر محال ہے۔ البتہ اس رسائی کی کوشش جائز بلکہ فرض ہے۔ کیونکہ اس کوشش سے تمام حرکت اور ارتقاء حیات ہے اور یہی وہ جواب ہے جو غالب کو کارگہ حیات میں نو بہ نو امکانات کے دریافت کی سبیل فراہم کرتا ہے:

گفتمش ذرہ بخورشید رسد، گفت محال
گفتمش کوشش من در طلبش، گفت بجاست (۲۸)

۲۔ وسعت مشاہدہ

غالب کا کلام اور علمی آثار اس امر کے گواہ ہیں کہ اسے زندگی کے حقائق اور جزئیات کا وسیع مشاہدہ حاصل تھا۔ مختلف متداول علوم وفنون سے آگاہی اور دراک طبیعت کا حامل ہونے کے باعث غالب نے جہاں حقائق حیات کو جامعیت سے بیان کیا، ان میں ایک ندرت بھی پیدا کر دی۔ علوم متداولہ اور اپنی فکری روایت سے غالب کی آگاہی حالی کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے:

> مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب ممدوح فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا۔ مطالعہ کر رہا تھا؛ اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آ نکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ انھوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔ (۲۹)

جب غالب کے فن پر معترضین نے اعتراضات کیے تو لطائف کی صورت میں ان کا جواب دیا گیا۔ لطائف غیبی کی جملہ تفصیلات غالب کی وسعت علم اور فنون پر کمال دسترس کی مظہر ہیں۔ یہاں صرف ایک مبحث ''پل صراط'' سے بطور مثال کچھ بیان کیا جاتا ہے:

منشی جی ۴۴ صفحے میں پل صراط کی بحث میں لغزشہائے پے در پے کے سبب پل کے ادھر جا رہے ہیں۔ خدا کرے بہشت میں گرے ہوں۔ دعا دینے کے بعد کہا جاتا ہے کہ نجم الدولہ نے قاطع برہان مطبوعہ کے ۴۱ صفحے میں جو اس کا ذکر کیا ہے تو یہ لکھا ہے کہ اہل اسلام کے سوا کسی اور مذہب و ملت میں پل صراط کا ہونا ثابت نہیں۔ جیسا کہ عیسائیوں میں اور موسائیوں میں اور ہنود میں کہیں عالم آخرت میں پل کے وجود کا پتا نہیں۔ ہر فریق میں معاد کی صورت جداگانہ ہے۔ پارسیوں کے کیش میں تناسخ بیشتر ہے بحسب درجات خیر و شر۔ نکوکار کم آزار اچھی صورت پائیں گے اور بدکاروں کو بری صورت ملے گی۔ نفوس کاملہ آواگون سے چھوٹ جائیں گے، کواکب بن جائیں گے۔ ظاہراً ہنود کے دھرم میں اور پارسیوں کے کیش میں معاد کا بیان ایک ہی نہج پر ہے۔ تفاوت اگر ہے تو کمتر ہے۔ منشی جی ان دقایق کو کیا جانیں؟ روئے سخن اہل علم و عقل کی طرف ہے۔ دساتیر کے ۱۴ صحیفے ہیں کہ بہ اوقات مختلفہ ۱۴ پیمبران پارس پر نازل ہوئے ہیں۔ ان میں سے ساتواں یا آٹھواں صحیفہ زردشت پر نازل ہوا ہے اور عقیدہ پارسیوں کا یہ ہے کہ کلام خدا اہل زمین کی زباں میں نہیں ہوتا۔ وہ آسمانی زبان ہے، السنہ معشر بشر سے الگ۔ ساسان پنجم، کہ وہ اپنے کو خاتم پیمبران پارس ظاہر کرتا ہے، ان صحیفوں کا زبان دری میں مترجم ہوا ہے۔ نماز کے ارکان اور حبس نفس جو ان کے مذہب میں گزیدہ ترین عبادات ہے اس کے قواعد، کواکب ہفتگانہ کی پرستش کے رسوم، باہم معاش کے قوانین، میراث کی تقسیم کے اطوار، ثواب و عتاب اخروی کے اخبار، مفصل اور مشرح مضبوط و مرقوم ہیں۔ فشار قبر اور پرسش نکیرین اور حشر اجساد اور میزان و نامۂ اعمال اور عبور پل کا کہیں ذکر نہیں۔ صحیفۂ موسومۂ زردشت بھی ان نقوش سے سادہ ہے۔ ہاں بہشت و دوزخ کا ذکر ہے، لیکن نہ اس طرح جس طرح اہل اسلام میں ہے، بلکہ لذائذ روحانی کو بہشت اور آلام روحانی کو دوزخ کہتے ہیں۔ جب ان صحائف میں جو زردشت سے پہلے نازل ہوئے ہیں اور زردشت کے صحیفے میں بھی پل کا ذکر نہیں تو ژند میں کہ وہ سات صحیفوں سے متاخر اور خود آٹھواں، معہذا ور صحیفوں کے مطابق ہے، چینود اور خنبور کہاں سے آ گیا؟ پارس کے منافقوں نے بعد استیلائے عرب، کیش اسلام از راہ فریب اختیار کیا۔ زردشت کی عظمت کے اظہار میں معراج اور نظارۂ خلد و سقر مع اخبار معاد جیسا عظمائے اسلام سے سنا، ہر شے کا ایک اسم وضع کر لیا۔ 'نبی' اور 'کراسہ' اور چینود و خنبور، یہ الفاظ سوائے نماز کے گھڑے ہوئے ہیں اور یہ صنعت عرب و عجم کے اختلاط کے تھوڑے دنوں کے بعد بروئے کار آئی۔ چنانچہ خلیفۂ ثانی کی خلافت میں ایک پارسی کی فتنہ انگیزی کتب سیر و اخبار میں مندرج ہے۔ اب یہاں غور کرنی چاہیے کہ شعر فارسی کا چرچا مایۂ ثالثہ ہجریہ میں ہوا ہے۔ چنانچہ رودکی مداح امیر اسماعیل سامانی اسی سنہ ۳ میں تھا۔ عسجدی و عنصری و دقیقی و فردوسی، یہ سب سلطنت محمود غزنوی میں کہ مایہ رابعہ، ہجریہ شروع ہو گیا تھا، بروئے کار آئے۔ کتب عربیہ سے آداب شعر و عروض و قافیہ و میزان بحور اخذ کر کے زبان پارسی میں شعر کہنا اختیار کیا۔ وہ الفاظ مستحدث اکثر درج منظومات کرتے رہے۔ چونکہ ان لغات کے واضع بطرف فرہنگ لکھنے کے متوجہ نہ ہوئے تھے، جیسا جس نے سنا، ویسا لکھ دیا۔ جیسا جس نے لکھا ہوا دیکھا، ویسا سمجھ لیا۔ الفاظ حقیقی فارسی قدیم میں بھی بحسب ضرورت یا از راہ اظہار قدرت لفظاً و معناً تصرف کیا، جیسا کہ 'خاور' بمعنی مغرب و 'باختر' بمعنی مشرق۔ پھر شعرائے عہد محمود غزنوی کے بعد بدعتیں اٹھتی گئیں اور الفاظ

غریبہٗ موضوعہ ترک ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ چینود وخنیو رفردوسی واسدی یا شاذ اور نادر اور شعرا کے کلام میں ایک آدھ جگہ کے سوا کہیں پایا نہیں جاتا اور یہ جو متاخرین میں فرزانہ بہرام وغیرہ تلامذہٗ آدرا کیوان نے اپنی نظم میں ان الفاظ کا استعمال یا صراط کا ذکر لکھا ہے، یہ لوگ تو واضعین لغات کے اخلاف واعقاب میں سے تھے اور اپنے اسی عقیدہٗ زردشتیہ پر ثابت قدم تھے، کیوں نہ لکھتے۔ کلام ان علمائے عجم میں ہے جو عظمائے اہل اسلام میں سے تھے۔ انھوں نے 'باختر' اور 'خاور' کا اضداد میں سے ہونا متروک اور لغات موضوعہٗ حادث کا استعمال یک قلم ترک کیا۔ خاقانی اور ناصر خسرو علوی کی نظم میں 'کراسہ' اور 'نبی' کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ بعد ان کے یہ لغات یک قلم متروک ہو گئے۔ نظامی وسعدی و جامی اور ان کے مابعد مجموع ناظمین اور ناثرین نے اس طرف منہ نہ کیا۔ رہے یہ فرہنگ لکھنے والے، نہ ان کے پاس کوئی ماخذ نہ ان کی بات میں کوئی میزان۔ اشعار قدما میں لغات دیکھ دیکھ کر موافق محل و مقام، وہ بھی محض از روئے قیاس، معنی لکھتے گئے۔ تین سو برس یعنی خلیفہٗ ثالث کے عہد سے محمود غزنوی کے وقت تک نقل در نقل ہونے میں کیا کیا تصحیف و تحریف واقع ہو گئی ہو گی۔ اس سے بڑھ کر چھ سات سو برس میں کیا صورت ہو گئی ہو گی۔ (۳۰)

مندرجہ بالا اقتباس علم لغت، تاریخ الفاظ و فرہنگ، لسانیات، تاریخ مذہب اور اکابر شعراء کے کلام و فن سے غالب کی آگاہی پر دال ہے۔ غالب کے کلام کا اس نقطہ نظر سے جائزہ بھی غالب کی اس استعداد کو نمایاں کرتا ہے کہ شاعری میں بھی غالب نے کئی علوم اور فنون کے بنیادی تصورات اور اصطلاحات کو اس طرح استعمال کیا ہے جو ان علوم و فنون میں بغیر کمال مہارت کے ممکن نہیں۔ چند اشعار بطور مثال یہاں دیے جاتے ہیں:

تصوف وجودی:

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں (۳۱)

ہمارے ذہن میں، اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو، تو کہاں جائیں؛ ہو، تو کیوں کر ہو (۳۲)

از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آینہ (۳۳)

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی (۳۴)

عرفان:

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے (۳۵)

فلسفہ:

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم!
لے لیا مجھ سے، مری ہمتِ عالی نے مجھے(۳۶)

ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ، آپ ہم اپنی قسم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے(۳۷)

علمیات:

کثرت آرائیِ وحدت، ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر، ان اصنامِ خیالی نے مجھے(۳۸)

ماہیت زماں:

تیری فرصت کے مقابل، اے عمر!
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں(۳۹)

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو، برق آفتاب ہے(۴۰)

کیمیا:

آگ سے، پانی میں بجھتے وقت، اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی، درماندگی میں، نالہ سے ناچار ہے(۴۱)

فزکس:

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں(۴۲)

ہوا چرچا جو مرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں، جنبشِ جوہر نے، آہن کو(۴۳)

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتَو سے آفتاب کے، ذرہ میں جان ہے(۴۴)

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر، موجِ آب کو، فرصت روانی کی(۴۵)

حیاتیات:

کہ زمیں ہو گئی ہے، سر تا سر
رُو کشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا رُوے آب پر کائی(۴۶)

طب:

اہل تدبیر کی واماندگیاں!
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں(۴۷)

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو(۴۸)

پی، جس قدر ملے، شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے(۴۹)

نہ پوچھ نسخۂ مراہم، جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے(۵۰)

نفسیات:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں(۵۱)

بے اعتدالیوں سے، سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے، اتنے ہی کم ہوئے(۵۲)

ہے وصل ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے(۵۳)

فلکیات:

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے(۵۴)

علم نجوم:

پیکر عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردش سیارہ کی آواز ہے(۵۵)

قاطعِ اعمار، ہیں اکثر نجوم
وہ بلاے آسمانی اور ہے(۵۶)

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں می دیکھنا!
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے(۵۷)

پامسٹری:

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جا آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی، گویا، رگِ جاں ہو گئیں(۵۸)

تاریخ:

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں(۵۹)

قید میں یعقوبؑ نے لی، گو، نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں(۶۰)

خطابت:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے(۶۱)

سیاست و آمریت:

لکھتے رہے، جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے(۶۲)

قانون:

پھر کھلا ہے درِ دعدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے(۶۳)

مصوری:

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے، کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ، اس کو حسرتِ دیدار ہے (۶۴)

نقش کو اس کے، مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جس قدر، اتنا ہی کھنچتا جائے ہے (۶۵)

خطِ عارض سے،لکھا ہے زلف کو الفت نے، عہد
یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے (۶۶)

جمالیات وحسن آرائی:

خطِ عارض سے،لکھا ہے زلف کو الفت نے، عہد
یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے (۶۷)

لباس:

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے در خور، مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ، چشم سوزن میں (۶۸)

موسمیات:

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
بَلا سے، آج اگر دن کو ابر و باد نہیں (۶۹)

کان کنی:

ہوا چرچا جو مرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں، جنبشِ جوہر نے، آہن کو (۷۰)

درس وتدریس:

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در، رہنِ سخن
تھا طلسم قفل ابجد، خانۂ مکتب مجھے (۷۱)

موسیقی:

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں (۷۲)

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے(۷۳)

خطاطی:

یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں(۷۴)

ہوں منحرف نہ کیوں، رہ و رسمِ ثواب سے!
ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو(۷۵)

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع، غالبؔ!
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو(۷۶)

خطِ عارض سے،لکھا ہے زلف کو الفت نے، عہد
یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے(۷۷)

۳۔زندگی کے مثبت پہلو پر نظر

غالب کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندگی کے مثبت پہلو پر نظر رکھتا ہے اور تصویر کتنی ہی یاس انگیز کیوں نہ ہو، غالب اس سے بھی کوئی مثبت پہلو ضرور نکال لے گا۔ ایک روز دوپہر کا کھانا آیا، دستر خوان بچھا، برتن تو بہت تھے مگر کھانا کم تھا۔ غالب نے مسکرا کر کہا: اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دستر خوان یزید کا دستر خوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار دیکھیے تو بایزید کا۔(۷۸) غالب کی زندگی مسائل، مشکلات اور پریشانیوں میں گزری۔ مگر زمانے کی تلخ روش کو بھی غالبؔ نے یوں دیکھا:

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں(۷۹)

محبوب سے تعلق میں بھی غالب کا یہی رنگ نظر آتا ہے:

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ! لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا(۸۰)

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا، مت پوچھ
عیدِ نظارہ، ہے شمشیر کا عریاں ہونا(۸۱)

ہنوز، اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
دلِ فسردہ، گویا، حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا(۸۲)

وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں، تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر، در و دیوار(۸۳)

ہم دیکھتے ہیں کہ جب شاہراہ حیات میں ایسے حالات کا سامنا ہو کہ اچھے اور برے حالات درپیش ہوں تو غالب کی نگاہ ہمیشہ اچھے حالات پر ہوگی، اور اگر ظاہراً اچھے حالات کا امکان نہ بھی ہو تو ناموافق ماحول سے بھی غالب موافقت کا امکان پیدا کر لیتا ہے:

کم نہیں ہے وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں، ہے مجھے وہ عشق کہ، گھر یاد نہیں(۸۴)

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ، یوں(۸۵)

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے، ساز کا(۸۶)

گھر میں تھا کیا کہ، ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے(۸۷)

سو غالب کے ہاں راہ حیات کی مشکلات، آسانی کا امکان اور فراق یار میں بہنے والا لہو تاریکی شب فراق کے تدارک کا سامان نظر آتے ہیں:

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں(۸۸)

یہ غالب کی وسعت فکر، قوت پرواز اور بلندیٔ تخیل ہے کہ وہ ہجر و فراق میں وصال، یاس و الم میں مسرت و شادمانی کا امکان تلاش کر لیتا ہے۔

ہے آدمی بجائے خود، اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو(۸۹)

۴۔ اسبابِ تخریب سے تعمیر کی استعداد

غالب کے ہاں "تخیل کی فکرِ کامل سے ہم نشینی" کا یہ عالم ہے کہ وہ ندیم دوست سے بوئے دوست اور قبلہ کی قبلہ نمائی سے مقصود قبلہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ خود کہتا ہے:

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے، اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا(۹۰)

قوت مشاہدہ اور حقائق کی معرفت کی یہی خوبی غالب کو اسبابِ تخریب سے تعمیر کی استعداد عطا کرتی ہے۔ کیونکہ جب خیر و شر سب ایک ہی ہستی کی طرف سے ہیں تو یاس و غم ہو یا مسرت و شادمانی ہر صورت میں بندے کے پیشِ نظر احوال نہیں بلکہ مصدرِ احوال اور صفات نہیں بلکہ ذات رہتی ہے:

یعنی، بہ حسب گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مے ذات چاہیے(۹۱)

اور جب عارف مستِ مے ذات ہوگا تو اس کے لیے نیستی سے ہستی کے امکان تلاش کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا کیونکہ نیستی و ہستی دونوں کی اصل ایک ہے:

نشوونما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے(۹۲)

زندگی اور نظامِ کائنات کے بارے میں غالب کا یہی تصور ہے جو غالب کو وہ استعداد عطا کرتا ہے کہ وہ اسبابِ تخریب سے بھی تعمیر کا سامان پیدا کر لے۔ وہی اسباب جو زندگی میں سدِ راہ نظر آتے ہوں، حصولِ مقصود کا امکان بھی بن سکتے ہیں، زندگی کے بارے میں اس طرح کا رویہ تبھی پیدا ہوتا ہے جب زندگی کے بارے میں اساسی نظریہ یہ ہو کہ:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن، زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا(۹۳)

غالب کے ہاں ایسے بیسیوں نظائر موجود ہیں کہ وہ کس طرح ان حالات میں امید اور حصول مقصود کے امکان کو دریافت کر لیتا ہے جب عام شعور آگے بڑھنے کا کوئی راستہ موجود نہیں پاتا۔ آگ سے دوچار ہونا اور اس کا عذاب ایک ایسی تکلیف ہے جس میں سوائے اذیت کے کچھ نہیں تلاش کیا جا سکتا۔ مگر غالب کے ہاں یہ بھی راحت کے نئے امکانات رکھتی ہے:

ملتی ہے خوئے یار سے نار، التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں(۹۴)

مشکلات جب انسان پر ٹوٹ پڑیں تو مشکلات ہی رہتی ہیں مگر غالب انہیں ایک بالکل نئے انداز سے دیکھتا ہے:

رنج سے خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں[۹۵]

غالب کو اپنے زمانے سے اپنی فنی عظمت کے اعتراف کے باب میں ہمیشہ گلہ رہا اور زمانے کی قدر ناشناسی کا سامنا رہا۔ غالب کی زندگی اور شخصیت کے اس پہلو کے بارے میں حالی لکھتے ہیں:

وہ اس خیال سے کہ ان کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اکثر تنگ دل رہتے تھے۔ چنانچہ اس بات کی انھوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں جا بجا شکایت کی ہے ایک روز قلعے سے سیدھے نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر آئے؛ اور کہنے لگے کہ ''آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا؛ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ ''مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو'' اس کے بعد نوب صاحب اور مرزا زمانے کی نا قدر دانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔[۹۶]

مگر جب اس المیے کو بیان کیا تو اسے یوں ایک خوشگوار رخ دے دیا کہ:

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پر یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں[۹۷]

الغرض غالب کے کلام میں ہمیں غالب کی شخصیت اور فن کے اس پہلو کی کئی مثالیں ملتی ہیں:

نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو[۹۸]

درماندگی میں غالبؔ! کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا[۹۹]

تنگی دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا[۱۰۰]

سراپا رہن عشق و نہ گزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا[۱۰۱]

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار، اب کھودنے پر گھاس کے ہے، میرے درباں کا[۱۰۲]

ہے خیال حسن میں، حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا(۱۰۳)

وفور اشک نے کیا کاشانہ کا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار(۱۰۴)

نہ پوچھ بے خودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے، سربسر، در و دیوار(۱۰۵)

گردش رنگ طرب سے ڈر ہے
غم محرومی جاوید نہیں(۱۰۶)

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے، راہ کو پرخار دیکھ کر(۱۰۷)

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا، یہ ساز ہستی ایک دن(۱۰۸)

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں(۱۰۹)

آج ہمارے معاشرے میں جب یاسیت، افراتفری اور دہشت زدگی کے ماحول میں زندگی بندگلی کی مثل نظر آنے لگے، غالب کی شاعری تازہ ہوا کا وہ جھونکا ہے جو ہمیں زندگی کے ان امکانات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو امید، تعمیر نو، اور آج سے بہتر کل کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ زندگی کے نو بہ نو امکانات کی دریافت جہاں غالب کے رفعت تخیل، قوت فکر اور فنی عظمت کے مرہونِ منت ہے وہاں اس میں ایک بڑا حصہ غالب کی شخصیت میں مذہب کے کردار کا بھی ہے۔ یہ وہ عنصر ہے جو غالب کی شخصیت کو وہ قوت عطا کرتا ہے کہ مایوسی کے گہرے دھندلکوں میں بھی امید کی کرن اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتی:

اس کی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند؟
واسطے جس شہؐ کے غالب گنبد بے در کھلا(۱۱۰)

حواشی و حوالہ جات

۱- ہیزن برگ کا نظریہ عدم تیقن نظامِ کائنات میں تعینات کی بجائے امکانات کو بیان کرتا ہے۔ خود ہیزن برگ کے بقول:

In quantum mechanics, the uncertainty principle is any of a variety of mathematical inequalities asserting a fundamental limit to the precision with which certain pairs of physical properties of a particle, such as position x and momentum p, can be known simultaneously. The more precisely the position of some particle is determined, the less precisely its momentum can be known, and vice versa. (Paraphrase of Heisenberg's uncertainty paper of 1927)

اسی طرح کوانٹم نظریات کے تحت ہونے والی تحقیقات کے مطابق یہ کائنات ایک سے زیادہ دنیاؤں پر مشتمل ہے:

MWI's main conclusion is that the universe (or multiverse in this context) is composed of a quantum superpositionof very many, possibly even non-denumerably infinitely many, increasingly divergent, non-communicating parallel universes or quantum worlds.

i. Everett, Hugh (1957). "Relative State Formulation of Quantum Mechanics". Reviews of Modern Physics 29: 454-462

ii. Steven Weinberg, Dreams of a Final Theory: The Search for the Fundamental Laws of Nature (1993), ISBN 0-09-922391-0, pg 68-69

iii. Steven Weinberg Testing Quantum Mechanics, Annals of Physics Vol 194 #2 (1989), pg 336-386

iv. Osnaghi, Stefano; Freitas, Fabio; Olival Freire, Jr (2009). "The Origin of the Everettian Heresy" (PDF). Studies in History and Philosophy of Modern Physics 40: 97-123.doi:10.1016/j.shpsb.2008.10.002.

v. Bryce Seligman DeWitt, R. Neill Graham, eds, The Many-Worlds Interpretation of Quantum Mechanics, Princeton Series in Physics, Princeton University Press (1973), ISBN 0-691-08131-XContains Everett's thesis: The Theory of the Universal Wavefunction, pp 3-140.

۲- اقبال، کلیات (فارسی)، جاوید نامہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص ۶۹۵۔

۳- اقبال، کلیات (اردو)، بانگ درا، نظم 'مرزا غالب'، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۵۵۔

۴- غالب، دیوان غالب (مالک رام)، غزل: ۵۸۔

۵- اقبال، کلیات (اردو)، بانگ درا، نظم 'مرزا غالب'، ص ۵۵۔

۶- غالب، دیوان غالب (مالک رام)، غزل: ۱۹۷۔

۷- ایضاً، غزل: ۸۔ ۸- ایضاً، غزل: ۳۲۔ ۹- ایضاً، غزل: ۴۹۔ ۱۰- ایضاً، غزل: ۱۹۷۔

۱۱- ایضاً، غزل: ۱۴۲۔ ۱۲- ایضاً، غزل: ۱۵۵۔ ۱۳- ایضاً، غزل: ۱۰۱۔ ۱۴- ایضاً، غزل: ۹۹۔

۱۵- بیدل، دیوان غزلیات (اکبر بھدار وند)، موسسہ انتشارات نگاہ، تہران، ۱۳۸۶، ج ۱، ص ۲۰۰۔

۱۶- محمود شبستری، گلشن راز، مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۸۰۔

۱۷- غالب، دیوان غالب (مالک رام)، غزل: ۱۶۳۔

۱۸- غالب، مرزا اسد اللہ، کلیات فارسی، شیخ مبارک علی تاجر و ناشر کتب، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۵۳۔

۱۹- ایضاً، ص ۱۵۴ ۲۰- ایضاً، ص ۱۹۹-۲۰۰ ۲۱- ایضاً، ص ۲۰۰

۲۲- ایضاً، ص۲۷۵-۲۷۶　۲۳- ایضاً، ص۲۷۶　۲۴- ایضاً

۲۵- غالب، دیوان غالب (مالک رام)، غزل:۹۹۔

۲۶- غالب، کلیات فارسی، ص۲۷۶　۲۷- غالب، دیوان غالب (مالک رام)، غزل:۱۳۹

۲۸- غالب، کلیات فارسی ص۲۷۶　۲۹- حالی، یادگارِ غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص۶۶

۳۰- غالب، لطائف غیبی، ص۵۱-۵۴

۳۱- غالب، دیوان غالب (مالک رام)، غزل:۹۹

۳۲- ایضاً، غزل:۱۲۶　۳۳- ایضاً، غزل:۱۲۹　۳۴- ایضاً، غزل:۱۴۹　۳۵- ایضاً، غزل:۱۹۷

۳۶- ایضاً، غزل:۱۵۵　۳۷- ایضاً، غزل:۱۶۸　۳۸- ایضاً، غزل:۱۵۵　۳۹- ایضاً، غزل:۱۰۹

۴۰- ایضاً، غزل:۱۵۳　۴۱- ایضاً، غزل:۱۴۴　۴۲- ایضاً، غزل:۹۶　۴۳- ایضاً، غزل:۱۲۱

۴۴- ایضاً، غزل:۱۳۹　۴۵- ایضاً، غزل:۱۶۶　۴۶- ایضاً، غزل:۱۸۲　۴۷- ایضاً، غزل:۱۰۹

۴۸- ایضاً، غزل:۱۲۰　۴۹- ایضاً، غزل:۱۴۱　۵۰- ایضاً، غزل:۱۹۸　۵۱- ایضاً، غزل:۱۱۲

۵۲- ایضاً، غزل:۱۶۸　۵۳- ایضاً، غزل:۱۸۹　۵۴- ایضاً، غزل:۱۳۹　۵۵- ایضاً، غزل:۱۴۸

۵۶- ایضاً، غزل:۱۶۱　۵۷- ایضاً، غزل:۱۷۰　۵۸- ایضاً، غزل:۱۱۲　۵۹- ایضاً، غزل:۹۹

۶۰- ایضاً، غزل:۱۱۲　۶۱- ایضاً، غزل:۱۵۸　۶۲- ایضاً، غزل:۱۶۸　۶۳- ایضاً، غزل:۱۶۵

۶۴- ایضاً، غزل:۱۴۴　۶۵- ایضاً، غزل:۱۵۴　۶۶- ایضاً، غزل:۱۹۳　۶۷- ایضاً

۶۸- ایضاً، غزل:۱۱۴　۶۹- ایضاً، غزل:۱۰۸　۷۰- ایضاً، غزل:۱۲۱　۷۱- ایضاً، غزل:۲۰۴

۷۲- ایضاً، غزل:۹۲　۷۳- ایضاً، غزل:۱۷۸　۷۴- ایضاً، غزل:۱۱۱　۷۵- ایضاً، غزل:۱۱۹

۷۶- ایضاً، غزل:۱۲۴　۷۷- ایضاً، غزل:۱۹۳

۷۸- حالی، یادگارِ غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص۶۹

۷۹- غالب، دیوان غالب (مالک رام)، غزل:۱۱۰　۸۰- ایضاً، غزل:۲۹

۸۱- ایضاً، غزل:۱۸　۸۲- ایضاً، غزل:۱۰　۸۳- ایضاً، غزل:۵۹　۸۴- ایضاً، غزل:۱۰۲

۸۵- ایضاً، غزل:۱۱۷　۸۶- ایضاً، غزل:۱۳　۸۷- ایضاً، غزل:۱۳۶　۸۸- ایضاً، غزل:۱۱۲

۸۹- ایضاً، غزل:۱۲۰　۹۰- ایضاً، غزل:۲۳　۹۱- ایضاً، غزل:۱۳۲　۹۲- ایضاً

۹۳- ایضاً، غزل:۴۸　۹۴- ایضاً، غزل:۹۸　۹۵- ایضاً، غزل:۱۱۲

۹۶- حالی، یادگارِ غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص۹۰۔

۹۷- غالب، دیوان غالب (مالک رام)، غزل:۱۰۱۔

۹۸- ایضاً، غزل:۱۲۱　۹۹- ایضاً، غزل:۳۱　۱۰۰- ایضاً، غزل:۳۲　۱۰۱- ایضاً، غزل:۱۲

۱۰۲- ایضاً، غزل:۱۰　۱۰۳- ایضاً، غزل:۱۴　۱۰۴- ایضاً، غزل:۵۹　۱۰۵- ایضاً

۱۰۶- ایضاً، غزل:۹۶　۱۰۷- ایضاً، غزل:۶۱　۱۰۸- ایضاً، غزل:۹۱　۱۰۹- ایضاً، غزل:۸۸

۱۱۰- ایضاً، غزل:۱۴